آثارالصنادید: دہلی کی ثقافتی اور تاریخی میراث

ڈاکٹراعجاز احمد
پرنسپل ،یٰسین میو ڈگری کالج نوح
aijazahmadnuh@gmail.com

خلاصہ

سرسید احمد خان (1817-1898) انیسویں صدی کے ایک سرکردہ ہندوستانی مسلم مصلح، عالم، اور فقیہ تھے ۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اوائل وقعت میں کمپنی سرکار کی ملازمت کے دوران دہلی کی تاریخی یادگارعمارتوں اور دیگر آثار قدیمہ کوقلم بند کرنے کوشش کی۔ ان کی سب سے قابل ذکر تصنیف، "آثارالصنادید" (دہلی کے نوادرات) پہلی بار 1847 میں شائع ہوئی جس میں دہلی اور اس کے آس پاس میں قدیم عمارتوں، قلعوں، مقبروں، مساجد اور دیگر آثار قدیمہ کے مقامات شامل ہیں۔ سر سید نے 1854 کے ایک مختصر ایڈیشن میں اس پر نظر ثانی کی جس میں حقائق کی درستگی پر توجہ دی گئی۔" آثارالصنادید" نے نہ صرف ان یادگارعمارتوں کے ریکارڈ کو محفوظ کیا جو اس وقت تک غائب یا خراب ہو چکے ہیں۔اس کتاب میں نوآبادیاتی آثار قدیمہ کی رسمی کوششوں کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے۔سرسید احمد خان کی انھیں کوششوں کی وجہ سے الیگزینڈر کننگھم نے سرسید کو ہندوستان کے پہلے مقامی تاریخی آثار قدیمہ کے ماہرین میں سے ایک کے طور پر جگہ دی۔سرسید احمد خان کے نقطہ نظر نے تجرباتی مشاہدہ کو ماضی کے رومانوی نقطہ نظر کے ساتھ ملایا جو عقلیت پسندی اور سائنسی تحقیقات کی طرف اس کی وسیع تر فکری تبدیلی کی عکاسی کرتا ہے۔

تعارف

سر سید احمد خان (1817-1898) کو اکثر مسلم قوم پرستی کے رہنما اور ایک سماجی اور تعلیمی مصلح کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ وہ 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں مغل دربار سے تعلق رکھنے والے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہیں اپنے گھر میں موجود تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ شاہی خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے انہیں اس زمانے کی بہترین تعلیم دی گئی تھی ۔ لیکن ان دنوں جب تعلیم ایک طے شدہ مینو نہیں تھی، انہوں نے مذہبی تعلیم، ادب اور فلسفہ، سائنس، ریاضی، عربی، فارسی اور اردو ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے فقہ اور اصول فقہ، قرآن، اردو اور عربی ادب بھی بہترین علماء سے حاصل کیاتھا ۔ ان کے خاندان کے بزرگانہ پس منظر کی وجہ سے انہوں نے روایتی

اسلامی تعلیم اور اپنے وقت کے ارتقا پذیر فکری مسائل دونوں تک انکی رسائی فراہم تھی ۔

سر سید احمد خان نے اپنے کیرئیر کا آغاز 1836 میں اپنے والد سید محمد خان کی وفات کے بعد صدر امین کے دفتر میں محکمہ فوجداری کے شرشتیدار کے طور پر کیا۔ 1841 میں انکے بڑے بھائی کی موت کے بعد ان کا تبادلہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں منصف (عدالتی افسر) کے عہدے پر فتح پور سیکری سے دہلی کر دیا گیا۔ 1846 سے 1854 تک انہوں نے دہلی کی عدالتوں میں کام کیا جہاں ان کے تجربے، دماغ اور کردار کومزید تقویت حاصل ہوئی ۔[1]

دہلی کے تاریخی ماحول اور اس کے کھنڈرات اور عظیم الشان یادگارعمارتوں کے ساتھ سید احمد خان کو بھی مسحورکر دیا ۔ سر سید احمد خان نے اپنی آمد کے فوراً بعد شہر کے فن تعمیر کا مطالعہ شروع کر دیا۔ انہوں نے بالآخر اپنے قریبی دانشور دوستوں کی مدد سے دہلی کی یادگارعمارتوں کا ایک محنتی ذاتی سروے کیا۔انکے انہیں دوستوں میں سبسے خاص تھے امام بخش صہبائی (1806-57) ۔ امام بخش صہبائی دہلی کالج کے شعبہ فارسی کے سربراہ تھے ۔ انہیں کے ساتھ سید احمد خان نے اپنا زیادہ تر فارغ وقت آثار قدیمہ کے کاموں میں صرف کیا اور آخر کار 1847 میں اپنی مشہور کتاب "آثارالصنادید" اور 1854 میں اس کا ترمیم شدہ ایڈیشن شائع کیا۔ سر سید احمد خان کے اس کام نے انہیں ہندوستان کا پہلا تاریخی ماہر آثار قدیمہ بنا دیا۔

سر سید احمدکے تخلیقی کاموں کی بنیاد پر انکی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: 1- 1857 کی بغاوت سے پہلےکے کام ۔ 2- 1857 کی بغاوت کے بعدکے کام ۔ اپنی زندگی کے پہلے حصے میں وہ دہلی کے آثار قدیمہ کی تحقیق اور سائنسی اور تاریخی تحقیقات میں زیادہ وقت لگا۔ اور کامیابی بھی حاصل کی ۔ اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی پوزیشن کو بہتر بنانے کے لیے وسیع تر قدم اٹھایا جو 1857 کی بغاوت میں حصہ لینے کی وجہ سے برطانوی مظالم کا بڑا ہدف تھے۔ یہ مقالہ ان کی زندگی کے پہلے حصے سے متعلق ہے جو بنیادی طور پر ان کے آثار قدیمہ کے کاموں اور ان کی کتاب" آثارالصنادید" کے متعلق ہے۔

اپنے سروس کیرئیر کے دوران سر سید احمدنے پڑھنے لکھنے کی اپنی تعلیمی مہارت کو بروئے کار لانے کی پوری کوشش کی ۔ دہلی اور آس پاس کے علاقوں کی عمارتوں اور کھنڈرات نے انہیں اس کام کو کرنے پر مجبور کیا جو ابھی تک ادھورا تھا۔ اپنے منصوبے کے مطابق سر سید احمد خان نے دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں طویل عرصے سے کھڑی اور تباہ حال عمارتوں کے آثار قدیمہ کے سروے کا کام شروع کیا۔ شاید یہ ان کا دیرینہ خواب تھا کیونکہ انہوں نے اسے اپنی عمر کی 20کی دہائی میں یعنی بہت چھوٹی عمر میں اس جوکھم

بھرے کام کو کرنے کے لیے چنا تھا۔ اس چھوٹی عمر میں دہلی میں اپنے خاندانی گھر میں رہتے ہوئے سر سید احمد خان ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک جونیئر اہلکار تھے۔ وہ اپنے بھائی کے اردو اخبار شائع کرنے اور فارسی مخطوطات کا ترجمہ کرنے میں مدد کرتے تھے۔ انکے بھائی کا پرنٹنگ پریس ان کی مشہور کتاب "آثارالصنادید" کی طباعت میں زیادہ مددگار ثابت ہوا۔[2]

سرسید بحیثیت تاریخ داں اور ماہر آثار قدیمہ

سرسید احمد خان کا شمار ایک اعلیٰ درجے کے مورخ اور ماہر آثار قدیمہ میں ہوتا ہے ۔ وہ ایک ہمہ گیر محقق اور نامور مصنف بھی تھے جنہوں نے تاریخ، آثار قدیمہ، سیاست، مذہب اور فلسفہ پر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں 25 سے زاید گراں قدر کتابوں کی تصنیف کی ہے ۔ سرسید کا تاریخ نگاری کا آغاز 1840 میں "جامِ جام "(1840) کی اشاعت سے ہوا۔ یہ 5000 سالہ ہندوستانی تاریخ کا ایک انمول اشاریہ تھا جس میں ہندوستان کے مختلف حکمرانوں کے نام، ان کی تاریخ ،پیدائش اور موت، ان کے باپ دادا اور یہاں تک کہ ان کی ماؤں کے نام بھی شامل ہیں۔ سرسید پہلے مسلمان تھے جنہوں نے تاریخ کے ماخذ کے طور پر عددیات(نیو مسمٹیکس) کو استعمال کیا۔ اس توسیعی مضمون کو بعد میں ایڈورڈ تھامس کی درخواست پر" سلسلات الملوک"(1852) کے نام سے ایک مکمل کتاب میں توسیع دی گئی ۔اس کتاب کو سرسید احمد خان نے دہلی کے پٹھان بادشاہوں کی تواریخ کے لیے بطور ماخذ استعمال کیا۔ تاریخ میں ان کی دلچسپی نے انہیں قرون وسطی کے ہندوستان کے اہم تاریخی کتابوں کے مطالعہ کی طرف راغب کیا۔ سر سید احمد خان نے 1855 میں" آئن اکبری" کی تدوین اور ترجمہ کیا۔ اگلی تصنیف" تاریخ فیروز شاہی" تھی جسے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے تنقیدی طور پر ایڈٹ کیا اور شائع کیا۔ سرسید نے خود 1863-64 میں "تزوک جہانگیری" کے نام سے مشہور سوانح عمری کو اپنے ہی پریس سے ایڈٹ کیا اور چھاپا۔

ان سب تاریخی کاموں کے باوجود سر سید احمد خان ایک ماہر آثار قدیمہ کے طور پر اپنے یادگار کام "آثارالصنادید"کے لیے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ کتاب دہلی اور اس کے ماحول میں مانومنٹس ، مساجد، مقبروں، باغات، پلوں اور دیگر تاریخی دلچسپی کے مقامات کا ایک قابل ذکر اور واقعی انسائیکلوپیڈک اکاؤنٹ ہے۔ "آثارالصنادید"اردو تاریخ نویسی میں ایک سنگ میل کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کتاب روایتی اور جدید طریقوں کے امتزاج کے ذریعے دہلی کی ثقافتی اور تاریخی میراث کو محفوظ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں سب سے اہم کام لال قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، جنتر منتر وغیرہ کی تفصیلی وضاحت ہے۔ جس میں پیمائش، تاریخی اکاؤنٹس، اور بنیادی ماخذات جیسے نوشتہ جات اور زبانی تاریخ کا استعمال کرتے ہوئے عکاسی کی گئی ہے۔

اسکے علاوہ یہ کتاب براہ راست مشاہدہ، ایک پروٹو سائنسی نقطہ نظر کی بھی عکاسی کرتی ہے۔انہوں نے ابھرتے ہوئے آثار قدیمہ اور تاریخی طریقوں کے ساتھ ہم آہنگی، پیمائش، خاکے، اور خود ہی اکاؤنٹس کا استعمال کیا۔ "آثارالصنادید"اردو کے ابتدائی کاموں میں سے ایک ہے۔ جو تاریخی دستاویزات کے لیے ایک منظم، شواہد پر مبنی نقطہ نظر کو اپناتی ہے۔اور جو روایتی فارسی تواریخ سے الگ ہے۔

سر سید احمد خان کی تاریخی اور آثار قدیمہ کی اشاعتیں انیسویں صدی میں نوادرات کے متنی مطالعے سے مشاہدے اور شواہد پر مبنی اکاؤنٹس اور آثار قدیمہ کے سروے کی طرف تبدیلی کا حصہ ہیں۔ مزید برآں، ان کی اشاعتیں نوآبادیاتی حکام کے لیے ایک اہم ذریعہ ہیں جو اپنے علاقے کا جائزہ لیتے ہیں۔ جیسا کہ مرنالینی راجگوپالن نے نوٹ کیا ہے کہ "آثارالصنادید" دہلی کے فن تعمیراتی ورثہ(آرکائیو) کا پہلا ذخیرہ تھا اور نوآبادیاتی (کولونیل)ما ہرین آثار قدیمہ کی اس کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ کے باوجود انہوں نے دہلی کی یادگارعمارتوں کے بارے میں اپنا آرکائیو علم تخلیق کرنے کے لیے سر سید احمد خان کی "آثارالصنادید" پر بہت زیادہ انحصار کیا ہے۔"[3] اس طرح، ہم سید احمد خان کے تاریخی آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیق کے نقطہ نظر کو دیکھ سکتے ہیں۔

سرسید احمد خان دہلی کے نوادرات پر کام کرنے کے میدان میں سرخیل تھے۔ یہ ایک اہم کوشش تھی اور اس میں کافی تحقیق اور فیلڈ کا کام شامل تھا۔ وہ اپنی تعطیلات اسی پر گزارتے تھے اور اکثر اپنے دوست امام بخش صہبائی کے ساتھ شہر سے باہر جا کر پرانی یادگارعمارتوں کے کھنڈرات کا جائزہ لیتے تھے اور ان کے کمروں وغیرہ کی پیمائش کرتے تھے۔ دہلی کے طبعی ڈھانچے پر کتاب لکھنے کا ان کا خیال صرف انہیں بیان کرنا ہی نہیں تھا بلکہ تندہی کے ساتھ ان کی پیمائش کرنا اور پھر انہیں بڑے سیاسی اور سماجی دور کے انوکھے پیمانوں سے جوڑنا تھا۔ پوری کتاب میں سرسید نے دہلی اور اس کے ماحول کی مختلف تعمیراتی باقیات کو بیان کیا ہے۔ اور ان باقیات کو ان کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی نوعیت کے حوالے سے تاریخی ذرائع سے حوالہ جات کے ذریعے تاریخی سیاق و سباق فراہم کیا ہے۔

سر سید آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سرخیل کے طور پر

دانشور معاشرہ یا فکری نشاۃ ثانیہ ہندوستان اور نوآبادیاتی علاقوں میں اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران تیار ہوئی۔ اس نے ماضی کے ثقافتی اور سائنسی ورثہ کو محفوظ رکھنے کے خیال کے ساتھ فنون علوم اور ادب کو فروغ دیا۔ "آثارالصنادید" میں سرسید احمد خان کے کاموں نے برطانوی حکومت اور ہندوستان میں ملازم دیگر اعلیٰ حکام کے لیے آثار قدیمہ کی

دلچسپیوں کو فروغ دیا ۔ یورپی اسکالرز کی طرف سے اس کے حتمی پذیرائی کی وجہ سے "آثارالصنادید" (1854) سید احمد کو سائنس کا مقبول بنانے والا قرار دینے کے لیے مضبوط ثبوت فراہم کرتا ہے۔ متعدد یورپی دانشوروں نے "آثارالصنادید" پڑھا، خاص طور پر فرانسیسی مستشرق جوزف ہیلیوڈور گارسن ڈی ٹیسی۔[4]

سرسید احمد خان کے کام سے پہلے ہندوستانی یادگارعمارتوں کے آثار قدیمہ پر کوئی بڑا کام نہیں کیا گیا تھا اور برطانوی حکام کو بھی دہلی کے عظیم پرانے شہر کے بوسیدہ ورثے کی پرواہ نہیں تھی۔ سرسید کی دلچسپیوں اور کاموں نے مطالعے کا ایک نیا میدان پیدا کیا جسے تاریخ دانوں اور برطانوی حکومت نے طویل عرصے سے نظرانداز کیاتھا ۔ 1861ء میں برطانوی فوج کے انجینئر الیگزینڈر کننگھم کو بالائی ہندوستان کے نوادرات کی چھان بین کے لیے حکومت ہند کا آرکیالوجیکل سرویئر مقرر کیا گیا اور ان کی خدمات 1861 سے 1865 تک جاری رہیں۔اس طرح 1861 میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی بنیاد رکھی گئی۔ 1865 کے بعد فنڈ کی کمی کی وجہ سے الیگزینڈر کننگھم انگلینڈ واپس چلے گئے ۔ 1871 میں رچرڈ بورکے (لارڈ مایو ، وائسرائے-1869-72) نے سروے کو دوبارہ قائم کیا اور کننگھم نے 1871 سے 1885 تک آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پراپنی خدمات کو انجام دیا ۔

الیگزینڈر کننگھم نے سرسید احمد خان اور انکی "آثارالصنادید" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "دہلی کے تومر خاندان کی درج ذیل فہرستوں میں وہ تمام معلومات موجود ہیں جو کہ میں اس وقت تک جمع کر سکا ہوں۔ ابوالفضل کی "آئین اکبری" میں دی گئی تمام فہرست بھی ہے ؛ اور سید احمد کی فہرست ان کے "آثارالصنادید" میں چھپی ہے۔ بیکانیر کا مخطوطہ، جو میں نے 1846 میں حاصل کیا تھا، ناموں کی ترتیب سے بالکل متفق ہے..."۔[5] الیگزینڈر کننگھم نے ہندوستان میں تمام تاریخی مقامات کو تلاش کرنے اور ان کی دستاویز کرنے اور سالانہ رپورٹیں شائع کرنے کے ایک منظم عمل کو شروع کرتے ہوئے اس طرح کے متن کی ضرورت کو پورا کیا۔ الیگزینڈر کننگھم نے سروے کی 1862 کی رپورٹ میں 40 مرتبہ سید احمد کا حوالہ دیا۔ اگرچہ انہوں نے سید احمد سے کئی نکات پر اختلاف کیا ہے، پھر بھی بنیادی طور پر 59 عمارتوں اور حکمرانوں کی تاریخوں کے حساب سے "آثارالصنادید" انکے کام کرنے کا ایک اہم ذریعہ تھا۔

کننگھم کے مباحث سے ظاہر ہوتا ہےکہ سید احمد کی اشاعتیں ان ذرائع میں سے ایک تھیں جن کا حوالہ نوآبادیاتی(کولونیل)حکومت نے دیا ہے۔اسکے باوجود بھی آخر کار ان کی شراکت کی اہمیت کو کم کر دیاگیا ہے ۔ بلاشبہ، "آثارالصنادید" ایک اہم اشاعت ہے اور اسے جنوبی ایشیا کے مورخین نے اچھی طرح سے شمار کیا ہے لیکن سائنس کے مورخین کی جانب سے آثار قدیمہ کے

باضابطہ ڈسپلن کی طرف نوادرات سے تبدیلی کی بحث میں زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اس طرح برطانوی آثار قدیمہ کا عروج بھی مقامی ترتیبات میں ذرائع اور مہارت کی تبدیلی کی علامت ہے۔

پرانی دہلی جسے اس وقت شاہجہان آباد کے نام سے بھی جانا جاتا تھا جسے مغل شہنشاہ شاہ جہاں (1592-1666) نے چاروں طرف دیوار کھڑی کرکے ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی تھی ،"آثارالصنادید"اسکی جیتی جاگتی داستان بیان کرتی تھی۔اس شہر کے سیاسی اور تاریخی اہمیت کی وجہ سے برطانوی دانشوروں کی بہت مانگ اور درخواست پر پرانی دہلی کے مجسٹریٹ اور کلکٹر سر رابرٹس نے کتاب "آثارالصنادید" کا انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی ترجمہ کبھی مکمل نہیں ہوا، ممکنہ طور پر اس لیے کہ کام ختم کرنے سے پہلے ہی رابرٹس کو دہلی سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ سرسید احمد خان کی پیدائش کی دو صدیاں مکمل ہونے کے بعد ان کی کتاب "آثارالصنادید" نے مورخین اور آثار قدیمہ کے ماہرین کی توجہ حاصل کی۔ ان کی کتاب نے محققین کو ان کے اس قسم کے کام کی روح کو سمجھنے کا ایک نیا میدان فراہم کیا جو پہلی بار کیا گیا تھا۔ اس طرح کی آثار قدیمہ کی دستاویزات کے ساتھ "آثارالصنادید" دہلی کے ورثے کا مطالعہ کرنے والے مورخین، ماہرین آثار قدیمہ اور شہری منصوبہ سازوں کے لیے ایک قیمتی وسیلہ ہے۔

آثارالصنادید

سرسید احمد خان کی "آثارالصنادید" جو یادگارعمارتوں اور آثار قدیمہ پر ایک نایاب کام ہے ،اب بھی 1847 اور 1854 کے دونوں ایڈیشنوں میں موجود ہے۔ دہلی کی یادگارعمارتوں ، فن تعمیر اور ثقافتی تاریخ کو دستاویز کرنے میں یہ سرسید کا اولین کام ہے۔ اس کتاب میں سر سید نے دہلی اور اس کے آس پاس کی تاریخ، یادگار عمارتوں کا تفصیلی بیان دیا گیا ہے جس میں علمائے کرام اور ان سے وابستہ دیگر ادبی شخصیات کی سوانحی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ یہ اپنے وقت کے لیے ایک اہم کام تھا جو شہر کے ماضی اور اس کے تعمیراتی ورثے کی ایک جھلک فراہم کرتا تھا۔ اسکالرز، جیسے مرنا لینی راجگوپالن، سی ایم نعیم، کرسچن ٹرول، اور ڈیوڈ لیلیویلڈ نے "آثارالصنادید"کے دونوں نسخوں کے درمیان فرق پر وسیع بحث کی ہے۔ تاہم بحث کے لیے دونوں ایڈیشنوں کا مختصر تعارف اب بھی درکار ہے۔

پہلا ایڈیشن" آثارالصنادید: امارا ت دہلی کی مستند تاریخ "، 1847 میں سرسید احمد خان کی پہلی بڑی اشاعت تھی، جو دہلی کے فن تعمیر کی کافی جامع وضاحت اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ "آثارالصنادید" (1947) میں ایک دیباچہ، چار ابواب اور سو سے زیادہ خاکے شامل ہیں۔ پہلا باب دہلی شہر سے باہر عمارتوں کی تفصیل ہے جس میں 100 سے زیادہ عمارتوں کی تفصیلی

وضاحت، ان میں سے ہر ایک کے منصوبے، اور ان کے نوشتہ جات کی درست نقل شامل ہے۔ یہ دہلی کا ایک طرح کا بصری دورہ ہے۔ دوسرا اور تیسرا باب لال قلعہ اور شاہجہان آباد کے آس پاس کے علاقے کے لیے وقف ہے۔ آخری باب دہلی کی ممتاز شخصیات کے تذکرے پر مشتمل ہے، جس میں ان کی تحریروں کے 69 نمونوں سے اضافہ کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نہ صرف عمارتوں بلکہ افراد کا بھی تفصیلی مطالعہ تھا۔ جیسا کہ ناتھ لکھتے ہیں، "کل 600 صفحات پر محیط ایک وسیع کام تھا۔ مرزا شاہ رخ بیگ اور فیض علی خان جیسے مصوروں کے بنائے گئے تقریباً 130 خاکے(ٹیکسٹ) اس کتاب میں شامل ہیں یہ خاکے متن کو واضح کرنے کے لیے لکڑی کےٹھپپوں سے چھاپے گئے تھے۔"[6]

سرسید کے ایک دوست آرتھر اے رابرٹس، مجسٹریٹ اور شاہجہان آباد کے کلکٹر اس کتاب کو انگلینڈ لے گئے اور اسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو پیش کیا جہاں سوسائٹی نے سرسید کو رکنیت عطا کی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک رکن کرنل سیکسن نے پھر تجویز پیش کی کہ رابرٹس کو متن کا انگریزی ترجمہ پیش کرنا چاہیے۔ تاہم، اس سے پہلے کہ انگریزی ترجمہ کیا جا سکتا، سید احمد خان کے متوقع برطانوی سرپرستوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا مطالعہ دوبارہ لکھیں، اس کے کارپس میں مزید وضاحتیں شامل کریں اور متن کی تشکیل نو کریں۔ تاہم، سب سے زیادہ نمایاں تبدیلی وہ تھی جو بالآخر اس زبان میں کی گئی جس میں متن لکھا گیا تھا۔ پہلے ایڈیشن کی زبان سخت اردو تھی، جو فارسی الفاظ سے بھری ہوئی تھی۔[7]

اسی مناسبت سے سرسید احمد خان نے اپنے "آثارالصنادید" کے منصوبے پر دوبارہ کام کیا اور بالآخر 1854 میں دہلی کی تعمیراتی تاریخ پر یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیک متن کے طور پر دوبارہ شائع ہوئی ۔ سرسید احمد خان نے درمیان میں ایک اور پراجیکٹ پر کام کیا جس کے ذریعے سرسید نے علماء میں زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ سر سید آرکیالوجیکل سوسائٹی آف دہلی کے ایک رکن بھی بنائے گئے جس کے صدردہلی کے ریذیڈنٹ سر تھامس میٹکاف تھے۔ اس حیثیت میں سر سید نے دہلی کی عمارتوں کے مختلف ڈھانچے کی تشکیل کرنے والی اینٹوں کی ساخت اور اجزاء کا جائزہ لیا اور اردو میں "ہندوستان میں مختلف زمانوں میں استعمال ہونے والی اینٹوں پر" کے عنوان سے ایک علمی مقالہ لکھا۔ سرسید نے اکتوبر 1852 میں سوسائٹی کے عجائب گھر کو دو اینٹیں بھی پیش کیں۔ اس مضمون کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا اور اس میں یہ اہم مشاہدہ ہے کہ یادگارعمارتوں کی عمروں کا اندازہ ان کی اینٹوں کی مضبوطی اور رنگت سے لگایا جا سکتا ہے۔ یقیناً سرسید کے فطری تجسس نے انہیں اپنے طور پر ایسی مفید دریافتیں کرنے پر مجبور کیا۔[8]

" آثارالصنادید" کے نئے ایڈیشن کی تدوین اور اصلاح میں سرسید کو رابرٹس کے ساتھ ساتھ دہلی کے سیشن جج اور ایک معروف نیومسمٹسٹ ایڈورڈ تھامس کی مدد حاصل تھی۔"آثارالصنادید"(1854) اردو میں لکھی گئی تھی لیکن اس میں کچھ انگریزی عناصر بھی تھے۔ سرسید نے شروع میں ایک باب کا اضافہ کیا، دوسرے باب میں بتائی گئی تاریخ کو بہتر بنایا اور چوتھے باب کو مکمل طور پر ہٹا دیا۔ نیا ایڈیشن اشرافیہ یورپی سامعین کے لیے قابل رسائی ہونے کے لیے لکھا گیا تھا اور اسی طرح ان میں تکسیم کر دیا گیا تھا۔ "آثارالصنادید" کے اس ایڈیشن کا پہلا باب مکمل طور پر ایک نیا اضافہ ہے اور اس میں تمام ہندوستان کی پہلی آبادی کی مختصر تاریخ اور پرانے اور نئے دور حکومت کے دارالحکومت یا سلطنت کے بارے میں تفصیلات شامل ہیں۔ اس ایڈیشن میں لال قلعے کے ساتھ ساتھ دہلی شہر کے پہلی بار آباد ہونے کے بعد سے بنائے گئے تمام قلعوں کا مکمل احوال موجود ہے۔ اس ایڈیشن میں عمارتوں کی تاریخیں باقاعدگی سے دی گئی ہیں۔ اس دوسرے ایڈیشن میں ایک اور اہم چیز ہے، یعنی عمارتوں پر پائے جانے والے نوشتے جات کو ان کی اصل شکل میں نقل کرکے دوسرے ایڈیشن میں داخل کیا گیا ہے۔ نیا ایڈیشن نہ صرف اظہار خیال میں بہتری ہے،بلکہ اس میں عمارتوں کے چند مزید چارٹ اور نوشتہ جات کی نقلوں کے ذریعے اضافی مواد شامل ہے۔ نیا ایڈیشن اردو کی سیدھی سادی مقامی نثر کی زبان میں تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔یہ ایک ایسا عمل تھا جو انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا تھا اور برطانوی مفادات سے بہت زیادہ متاثر تھا۔[9]

سر سید کی کتاب "آثارالصنادید" اردو تاریخی اسکالرشپ میں ایک اہم کوشش کی نمائندگی کرتی ہےاور تجرباتی مشاہدے کو ثقافتی تحفظ کے ساتھ ملاتی ہے۔یہ کتاب کولونیل تناظر میں دہلی کی تاریخی میراث اور سرسید کے فکری نقطہ نظر کو سمجھنے کے لیے ایک اہم لینس کا کام کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ"آثارالصنادید" سر سید کی ایک بہت بڑ ی تصنیف ہےاور اس کتاب نےاور سرسید کی وسیع تر کوششوں نے تعلیم اور سماجی اصلاح میں خواندگی کو فروغ دینے اور تاریخ اور ثقافت کی وسیع تر تفہیم کے ذریعے آثار قدیمہ کے مطالعہ کی بالواسطہ حمایت کی ہے ۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف تک دہلی اور آس پاس کے بیشتر آثار قدیمہ ملبے میں تبدیل ہو چکے تھے اور برطانوی حکومت کی طرف سے ان کی بحالی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی جا رہی تھی ۔ ان حالات میں ایک پیدائشی مورخ اور عالم سر سید احمد خان نے اپنی کتاب "آثارالصنادید" میں ان یادگارعمارتوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ نہ صرف سرسید احمد خان بلکہ دہلی کے آثار قدیمہ کی تباہی کی وضاحت بہت سے دوسرے علماء نے بھی کی۔ جب کلکتہ کے بشپ نے 1824 کے آخری دنوں میں شاہجہان آباد کا دورہ کیا

تو وہ ہمایوں کا مقبرہ دیکھنے نکلے۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا، "آگرے کے دروازے سے لے کر ہمایوں کے مقبرے تک ویرانی کا ایک بہت ہی خوفناک منظر ہے، کھنڈرات کے بعد کھنڈرات، مقبروں کے بعد مقبرے، اینٹوں کے ٹکڑے، فری اسٹون، گرینائٹ اور سنگ مرمر، قدرتی طور پر پتھریلی اور بنجر زمین پر ہر جگہ بکھری ہوئی، بغیر کاشت کے، سوائے ایک یا دو چھوٹے مقامات کے، اور ایک درخت کے بغیر۔ ... کھنڈرات حقیقت میں اس حد تک پھیلے ہوئے تھے جہاں تک نگاہ پہنچ سکتی تھی اور ہمارا ٹریک ان کے درمیان ہی زخم کھاتا رہا۔"[10]

بدقسمتی سے 1857 میں جنگ آزادی اور ہندوستان کی باضابطہ کولونائزیشن کے بعد"آثارالصنادید" میں درج متعدد ڈھانچے کو منہدم کر دیا گیاتھا جس میں دہلی کے لال قلعے کے اہم حصے بھی شامل ہیں۔ خوش قسمتی سے ان حالات میں معلومات کا واحد ذریعہ "آثارالصنادید" تھی ۔ مزید برآں، مسلم، بدھ اور ہندو یادگارعمارتوں کا یکساں سروے کرکے، ایک ہندوستانی زبان میں جو سماجی طور پر وسیع پیمانے پر قابل رسائی تھی، کوئی شک نہیں ایسا متن انقلابی تھا۔

دہلی اور ملحقہ علاقوں کے آثار قدیمہ پر کام کرنا سر سید احمد خان کے لیے ایک مشکل چیلنج تھا۔ اس میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کی مشقت شامل تھی۔ جسمانی مشقت میں بعض اوقات جان کا خطرہ بھی لاحق ہوتا تھا ۔ جسمانی مشقت اور خطرہ یہ تھا کہ اس کام کو کرنے کے لئے سر سید احمد خان لکڑیوں سے بنی ہوئی ٹرے میںبیٹھ جاتے تھے اور اسے رسیوں سے بہت زیادہ اونچائیوں تک اٹھانے کے لئے کھینچا جاتا تھا ۔ تاہم یہ مشکلات سر سید کو اس کام کی تکمیل سے باز نہ رکھ سکیں جو انہوں نے اپنے سامنے رکھا تھا۔ بڑے صبر کے ساتھ سر سید احمد خان نے اپنا کام جاری رکھا اور بالآخر اسے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ جب وہ اس کام کے لیے معلومات اکٹھا کر رہے تھے تو انھیں ان کے نوکروں اور دہلی کالج کے فارسی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ مولوی امام بخش نے پیمائش اور تحریروں میں مدد کی ۔ سر سید احمد خان کے ساتھ دو ڈرافٹ مین فیض علی خان اور مرزا شاہ رخ بیگ نے بھی کام کیا۔ سید احمد نے معلومات اکٹھی کرنے کے لیے کافی وقت اور وسائل صرف کیے تھے۔ سر سید احمد خان کو "ایک ٹوکری میں سوار کر کے اوپر سے دو کھمبوں کے درمیان لٹکا دیا تاکہ نوشتہ جات کو پڑھا جا سکے"۔ سر سید احمد خان اپنے نوکروں سے اینٹوں کے نمونے اکٹھے کروایا کرتے تھے ۔[11]

الطاف حسین حالی لکھتے ہیں: "شہر سے باہر پڑی عمارتوں کے بارے میں تحقیق کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، ان عمارتوں میں سے بہت سی عمارتیں گر چکی تھیں اور کھنڈراتکی شکل میں پڑی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر نوشتہ جات یا تو ناقص یا نامکمل تھے اور کچھ رسم الخط میں لکھے گئے تھے،

جنہیں پڑھنا کوئی نہیں جانتا تھا۔کچھ قدیم عمارتوں کے اہم ترین حصے منہدم ہوچکے تھے اور موجودہ باقیات سے جو وسیع رقبے پر بکھرے ہوئے تھے آسانی سے یہ طے نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ عمارتیں کس مقصد کے لئے کھڑی کی گئی تھیں۔ اگر عمارات کے بانی کے نام نوشتے میں موجود ہو تو تھی مکمل تفصیل لکھے جانے سے پہلے دستیاب تاریخوں کے ساتھ حوالہ جات کی جانچ پڑتال کی جانی تھی۔ کچھ پرانی عمارتوں میں اتنی بڑی تبدیلی کی گئی تھی کہ یہ دریافت کرنا ناممکن تھا کہ ان کی اصل منصوبہ بندی کیسے کی گئی تھی۔ اس طرح تقریباً 125 عمارتوں کا تفصیلی احوال لکھنے، نوشتہ جات کو ان کی صحیح شکل میں تلاش کرنے اور دوبارہ تیار کرنے اور ہر ٹوٹی ہوئی عمارت کے منصوبہ بنانے سے بہت سے مسائل پیدا ہوئے۔ سرسید کو معلوم ہوا کہ قطب مینار پر کچھ نوشتہ جات پڑھنے کے لیے بہت زیادہ ہیں۔ لہٰذا، صحیح نقل حاصل کرنے کے لئے وہ ایک ٹوکری میں بیٹھ جاتے ، جسے نوشتے کے متوازی دو سہاروں کے درمیان لٹکا دیا جاتا تھا۔ جب وہ یہ آپریشن کر رہے تھے تو ان کے دوست مولانا صہبائی خوف سے بالکل پیلے پڑ جاتے تھے۔"[12]

" آثارالصنادید" کی شکل میں آثار قدیمہ میں سر سید احمد کا تعاون لازوال اور دیرپا ہے۔ دہلی جو کسی زمانے میں بہت اہمیت کا حامل شہر تھا، اسکی عمارتوں کے بارے میں اس مفصل اور مستند تصنیف کی اہمیت اس وقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے جب ہم اس کے لکھے جانے کے زمانے کو ذہن میں رکھتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس کام کو لکھنے اور ترتیب دینے میں مصنف کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے آثار قدیمہ کی کچھ تفصیلات درج ذیل ہیں۔

لاٹھ اشوکا، مینارِ زاریہ یا لاٹھ فیروزشاہی

دہلی میں اشوکن ستون فیروز شاہ کوٹلہ میں نصب ایک سنگسار ستون تھا جسے مینارِ زاریہ یا لا ٹھ فیروز شاہی بھی کہا جاتا ہے۔ جس زمانے میں سلطان فیروزشاہ تغلق 1368 میں ٹھٹھہ میں قلعہ بنانے کے بعد واپس دہلی آرہے تھے تو انہوں نے گاؤں نوہرہ، سب ڈویژن سلورا، ضلع خضر آباد میں ایک کورنڈ پتھر کا ستون دیکھا جو دہلی سے نوے کوس کے فاصلہ پر واقع تھا ۔ اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ستون وہ چھڑی ہے جسے بھیم (بھیم مہابھارت کا ایک ہندو افسانوی کردار تھا جو پانڈو کے بیٹوں میں سے ایک تھا) اپنی گایوں کو چرانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ فیروز شاہ نے اس ستون کو اس کے اصل مقام سے اکھاڑ کر دہلی لانے کا فیصلہ کیا اور منصوبہ کے مطابق اسے دہلی منتقل کر دیا تاکہ اسے طویل عرصہ تک یاد رکھا جائے۔ ستون کو دہلی لانے کے لیے بیالیس پہیوں کی ایک ویگن بنائی گئی اور دو سو آدمیوں نے ان رسیوں کو کھینچ کر ویگن کو حرکت دی۔ ہزاروں آدمیوں نے کالم کو دریا کے کنارے تک لے جانے کے لیے

محنت کی جو کہ نوہرہ گاؤں کے پاس سے بہتی تھی۔ کئی کشتیاں ایک ساتھ
باندھ کر ستون کو اُٹھایا گیا اور پھر دریا پار کر فیروز آباد لے جایا گیا اور آخر کار
فیروز شاہ قلعہ میں لایا گیا جہاں اسے مسجد کے قریب تین منزلہ ڈھانچہ بنایا
گیا اور اس کی چوٹی اس پر پتھر کے ستون کو چٹانی اور چونا پتھر کی بنیاد بنا کر
لگایا گیا۔اس خوبصورت برج بنانے کے لیے سب سے اوپر سفید اور سیاہ سنگ
مرمر کا استعمال کیا گیا تھااور اوپر سونے سے چڑھا ہوا تانبے کا چادر رکھا گیا
تھا۔اس وجہ سے اس ڈھانچے کو مینارِ زرین کا نام دیا گیا ۔ یہ بدقسمتی کی بات
ہے کہ اب نہ تو مینار ہے اور نہ ہی سونے سے چڑھا ہوا تانبے کا چادر رہ
درحقیقت ستون کا سرے بھی ٹوٹ چکا ہے۔ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ
نقصان آسمانی بجلی گرنے یا بموں سے ہوا ہے۔ ستون کی لمبائی بتیس فٹ تھی
جسمہ وہ ستون عمارت میں آٹھ گز دھنسا ہوا تھا اور چوبیس گز اوپر اٹھا ہوا
تھا ۔[13]

اس ستون پر دو تحریریں ہیں جن میں ایک نوشتہ کی زبان پالی اور
دوسرے کی سنسکرت ہے ۔انکے حروف بہت پرانے رسم الخط کے ہیں جو
دیوناگری رسم الخط سے پہلے کا ہے۔ یہ نوشتہ پہلے سمجھ میں نہیں آیا
تھااسکے لئے فیروزشاہ نے بہت سے پنڈت اکٹھے کیے تھے لیکن وہ بھی زبان کو
سمجھنے سے قاصر تھے۔اور اب مسٹر جیمز پرنسپ (وہ ایک نامور نمسیٹسٹ اور
فلولوجسٹ تھے، جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری بنے تھے۔ ان کا
سب سے قابل ذکر علمی تعاون تھا جو پالی کے اسکرپٹ کا بنیادی ترجمہ تھا جو
اشوک پر شائع ہوا۔ موریان انڈیا) نے متن کو پڑھا اور ترجمہ کیا ہے۔[14]

پہلا نوشتہ اشوک بادشاہ کے نام پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ اشوک
تقریباً 325 قبل مسیح میں تخت نشین ہوئے تھے اور یہ ستون ستائیسویں رجال
سال یا 298 قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس اعلان میں بدھ کی تعلیمات،
دوسروں کو نقصان نہ پہنچانے اور مجرموں پر انتقامی کارروائی اور جسمانی
سزا کے قوانین پر عمل نہ کرنے کا حکم شامل ہے۔ ستون پر دوسری نوشت بلدیو
(بسالدیو) چوہان کا نام ہے۔ وہ ابتدائی طور پر سنبھر کا بادشاہ تھا جہاں سے
چوہان خاندان کا آغاز ہوتا ہے۔ دہلی کے حکمرانوں کے خلاف جنگ کر کے اس نے
سرزمین فتح کر لیے رائے پتھورا نے اپنے دور حکومت میں جو کہ 1163 تھااس
ستون پر اپنے آباؤ اجداد کی فتح کی کہانی لکھی تھی۔ اس نوشتہ کے حروف دیونا
گیری رسم الخط میں ہیں اور یہ سنسکرت زبان میں ہے۔ اس فرمان کے جملے
آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ متن میں بلدیو کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کی
صفات کی فہرست دی گئی ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کی حکمرانی نے
ہندوستان میں امن قائم کیا۔[15]

قطب مینار

سر سید احمد خان قطب مینار کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی مینار کے نیچے کھڑا ہو کر آسمان کی طرف دیکھے تو ٹوپیاں اور پگڑیاں سر سے نیچے گر جاتی تھیں ۔ کالم کے اوپر سے نیچے کی طرف دیکھیں تو زمین پر لوگ بہت چھوٹے لگتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے ہاتھیوں اور گھوڑوں کو دیکھنا بہت عجیب لگتا ہے۔ اسی طرح زمین پر رہنے والے اوپر والے لوگوں کو چھوٹے نظر آتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ آسمان سے اترے ہوئے فرشتے ہوں۔ اس طرح یہ ستون ایک معجزاتی دور سے ہے۔

سر سید احمد خان نے ذکر کیا ہے کہ مینار کا سب سے نچلا حصہ باری باری گول اور مربع انگیجڈ کالموں سے مزین ہے، دوسرا سیکشن مکمل طور پر کروی انگیجڈ کالموں پر مشتمل ہے، تیسرا مکمل طور پر مربع انگیجڈ کالم ہے، جس کے سب سے زیادہ دو حصے مکمل طور پر گول ہیں۔ ڈھانچہ مکمل طور پر سرخ پتھر سے بنایا گیا ہے، سوائے چوتھے درجے کے جہاں سفید سنگ مرمر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ہر جگہ جڑائی کا کام اور پینٹنگ اس شان سے ہوتی ہے کہ ہر تراشی ہوئی بیل بہت سے دوسرے کے ساتھ بے انتہا جڑی ہوئی ہے، اور یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے پھول اور شاخیں بھی درجنوں بکھرے ہوئے رنگوں کے اشارے سے تخلیق کی گئی ہیں۔ یہ تمام عناصر ایک یادگار بناتے ہیں جو بہت دلچسپی کا باعث ہے۔ اکثر مسلمانوں کا خیال ہے کہ سلطان شمس الدین التمش نے کالم تعمیر کیا تھا اور یہ معلومات اکثر تاریخ کی کتابوں میں نظر آتی ہیں۔[16]

سرسید کہتے ہیں کہ یہ مینار نہیں ہو سکتا کیونکہ کالم کا دروازہ ہندو مندروں کی طرح شمال کی طرف ہے جبکہ میناروں کے دروازے ہمیشہ مشرق کی طرف ہوتے ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ سلطان علاؤالدین کے شروع کردہ ستون جو ایک چبوترے پر واقع تھااس کا دروازہ کا مشرق کی طرف تھا اور جیسا کہ مسلمانوں کی تعمیر میں عام ہے۔ یہ ان ہندوؤں کے برعکس ہے جو چبوترے کا استعمال نہیں کرتے۔ اس یادگار مینار سے چبوترے کی ایک خصوصیت بھی غائب ہے۔ ڈھانچے کی پہلی سطح بعد کے مرحلے میں پتھروں کے رکھے جانے کے ثبوت بھی دکھاتی ہے اور پہلی منزل پر ہندو مندروں کی گھنٹی اور زنجیر کی شکل کا ثبوت بھی ملتا ہے۔مزید برآں، اس ستون پر لکھا ہوا تحریر قطب الدین ایبک اور معزالدین کی تبدیل شدہ مندر- مسجد پر فتح سے ملتی جلتی ہے۔ ان مختلف حقائق سے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ پہلی منزل اصل میں ہندو راجہ نے بنوایا ہوگا ۔ اس میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے کہ جہاں کبھی بت تھے وہاں تصنیفات لکھے گئے ہیں۔ یہ افسانہ بن گیا ہے کہ بادشاہ رائے پتھورا کی تعریف کرنے والے پتھروں کی جگہ بادشاہوں کے نام اور قرآنی آیات لکھی گئی تھیں۔ اس عقیدے نے اس عقیدے کو جاری رکھنے میں مدد کی ہے کہ قلعے اور مندر کے علاوہ

رائے پتھورا نے بھی 1143 میں اس ستون کو تعمیر کرنے کی کوشش کی تھی جو پورا نہیں ہو سکا ہوگا ۔یہ ایک طرح سے سچی بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ رائے پتھورا کی بیٹی سورج کی عبادت کرنے والی تھی اور ہندوؤں کا ماننا ہے کہ دریائے جمنا سورج کی بیٹی ہے، اسی لیے جمنا کی زیارت کو ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے ستون کو سب سے پہلے ایک مقام پر تعمیر کیا گیا تھا جہاں سے جمنا کی پوجا ہو سکتی تھی۔ 1191 میں جب مسلمانوں نے مندر کو فتح کیا تو انہوں نے عمارت پر اپنے اپنے خطوط جوڑے اور فضل ابن ابوالمعالی کواس کا نگران بنایا اور اس کا نام داخلی دروازے کے قریب لکھا۔ اس یادگار مینار کو اسی وقت 1229 میں اونچا کیا گیا جب سلطان شمس الدین التمش نے مسجد کو دو اطراف میں تین اضافی محرابیں جوڑ کر وسیع کیں۔ توسیع دیوار پر لکھی ہوئی تحریروں میں درج ہے۔ تب سے اس کالم کو مینار کہا جاتا ہے جس کی ہر سطح پر تحریریں ہیں۔[17]

سر سید احمد خان مزید کہتے ہیں کہ آج اس ڈھانچے کے کھنڈرات کے پانچ مجموعے موجود ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں جیسا کہ افسانوی ہے کہ کسی زمانے میں یہاں سات منزلیں تھیں اور کالم" مینارِ ہفت منظری" (سات نظاروں کا مینار) کے نام سے بھی مشہور تھا۔ اب جہاں ریلینگ ہے وہاں ایک زمانے میںفصیلوں کی طرح کرینلیشنز (بٹلمنٹس)ہو تے تھے۔ پانچویں سطح پر چاروں طرف دروازے تھے اور اس کے اوپر ساتویں منزل بنانے کے لیے چھتری رکھی گئی تھی۔ فیروز شاہ نے 1368 میں ساتویں منزل کی تعمیر کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ تعمیر کے وقت اس نے کالم کی اونچائی موجودہ سطح سے بلند کی تھی اور پانچویں درجے کے دروازے پر تعمیراتی معلومات لکھی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد کالم کو دوبارہ نقصان پہنچا۔ 1503 میں سکندر بہلول کے دور میں فتح خان نے بھی ڈھانچے پر کچھ کام کروایا تھا اور کالم کے دروازے کے اوپر تعمیر کی حیثیت کندہ تھی۔ایسا بھی مشہور ہے کہ 1782 میں مٹی کے شدید طوفان اور زلزلے کی وجہ سے بالائی سطح زمین پر گر گئی تھی ۔ اصل تعمیر کے پتھر بھی گر گئے تھے اور بعض جگہوں پر شگاف پڑ گئےتھے ۔ 1829 میں کیپٹن اسمتھ نے برطانوی حکومت کے حکم پر پورے کالم کو بحال کر دیا۔ اس نے کرینلیشنز کو پتھر کی ریلینگ سے بدل دیا۔ پانچویں سطح پر پیتل کی خوبصورت ریلنگ لگائی گئی اور چھٹے درجے کو آٹھ کھڑکیوں کے ساتھ ایک خوبصورت پتھر کے برج سے تبدیل کیا گیا تھا۔ ساتویں درجے کو کاٹ کر لکڑی کے برج کو معیار سے اوپر رکھا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی ٹاور برقرار نہیں رہا۔ پتھر کے برج کو کالم سے اتار کر نیچے زمین پر رکھ دیا گیا اور لکڑی کا برج اب موجود نہیں ہے۔[18]

سرسید کہتے ہیں کہ آج تک اس یادگارمینار کے نوشتہ جات نہیں پڑھے گئے تھے۔ سر سید نے ہی ان سب کو دوربین کی مدد سے پڑھا ہے۔ پہلے کالم

کی اونچائی بتیس گزاور کچھ انچ، دوسرے کی سترہ گزاور کچھ انچ، تیسرے کی تیرہ گز اور چوتھے کی آٹھ گز اور چوتھائی گز ہے۔ موجودہ پانچ درجوں کی کل لمبائی تقریباً اسی گز ہے اور انگریزوں کے بنائے ہوئے پتھر کے برج کی لمبائی چھ گز ہے۔ تمام لاپتہ عناصر کے ساتھ مکمل ڈھانچہ ایک سو گز کا ہوتا ہے وہ اونچائی ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ کالم اس وقت حاصل ہوا جب اس کی سات مکمل سطحیں تھیں۔زمین پر کالم کا طواف پچاس گز ہے جو پھر اوپر سے دس گز کے فریم تک گھٹ جاتا ہے۔ یہ یادگار مینار اندر سے بالکل خالی ہے، صرف سیڑھیاں دیواروں کے ساتھ مخالف گھڑی کی سمت میں گردش کرتی ہیں۔ پہلے درجے میں 156 سیڑھیاں ہیں، دوسری میں 78 سیڑھیاں، تیسری میں باسٹھ سیڑھیاں، چوتھی میں اکتالیس سیڑھیاں اور پانچویں میں بھی اکتالیس سیڑھیاں ہیں۔ اس طرح کل سیڑھیوں کی تعداد 378 بنتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہمیشہ سے اتنی سیڑھیاں ہوتی رہی ہیں، کیونکہ دو اوپری منزلوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔[19]

جہاں نما مسجد یا گرانڈ ماسق

جہان نما مسجد کو شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں نے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تعمیر کیا تھا جس کی نزاکت اور خوبصورتی بیان سے باہر ہے۔ مسجد کی بنیاد 10 شوال 1060 ہجری (1650) کو وزیر سعد اللہ خان اور خان سمعان فاضل خان کی نگرانی میں چوبیسویں حکومتی سال میں رکھی گئی تھی۔اس کی تعمیر میں ہر روز پانچ ہزار مستری، مزدور، کھودنے والے اور پتھر کاٹنے والے اس جگہ پر کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود مسجد کو مکمل کرنے میں چھ سال لگے اور مجموعی طور پر دس کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ اسے ایک انتہائی ماہر معمار نے اس مسجد کو تعمیر کیا تھا ۔اس کا ہر دروازہ، دیوار، محراب، طاق اور سجاوٹ احتیاط سے بھری ہوئی ہے۔پورا ڈھانچہ سرخ پتھر سے بنایا گیا ہے جس میں سفید اور سیاہ سنگ مرمر اور اندرونی حصے میں سفید سنگ مرمر کا کام کیا گیا ہے۔ اس عمارت میں تین بہت ہی خوبصورت گنبد ہیں۔ تمام گنبد سیاہ سنگ مرمر کی لکیروں کے ساتھ سفید سنگ مرمر سے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کی لمبائی نوے گز اور چوڑائی بیس گز ہے۔ قبلہ کی دیوار کے سات طاق ہیں اور باہر صحن کی طرف گیارہ محرابیں ہیں۔ ایک محراب بہت اونچی ہے جس کی ہر طرف پانچ محرابیں ہیں۔ تمام محرابیں جڑنے کے لیے سیاہ سنگ مرمر سے کندہ ہیں۔ مرکزی محراب پر تغرا "یا ہادی"لکھا ہوا ہے اور باقی محرابوں پر شاہ جہاں کی تعریف، تعمیر کی تاریخ اور اخراجات کی تفصیلات درج ہیں۔[20]

اس مسجد میں گیلری کے دونوں طرف انتہائی اونچے اور شاندار مینار ہیں جن کی چوٹی تک جانے کے لیے سیڑھیاں لگی ہوئی ہیں۔ میناروں میں بارہ

کھڑکیاں ہیں اور سب سے اوپر تاج کی طرح خوبصورت چھتری جو بہت ہی جو شاندار ہیں۔ میناروں کے اوپر سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ شہر کا منظر پیالے جیسا ہے، اور درخت اور گھر اس منظر کو متحرک کرتے ہیں۔آسمانی بجلی گرنے سے شمالی مینار گر گیا تھا اور صحن کے فرش کے ساتھ ساتھ سرخ پتھر کے دونوں حصوں کو بھی نقصان پہنچا تھا ۔1817 میں اکبر شاہ کے دور میں انگریزوں نے مینار اور فرش کو بحال کیاتھا ۔ الله کا شکر اور مہربانی ہے کہ اس مسجد میں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد ایک ساتھ نمازعدا کر سکتی ہے کہ دیکھنے میں لوگ چیونٹیوں کی طرح لگتے ہیں اور بہت سے نمازیوں کو تو امام کی آواز نہیں سنائی دیتی ۔ چنانچہ شاہ معین الدین محمد اکبر شاہ کے بیٹے شہزادے مرزا سلیم نے 1829ء میں مرکزی محراب کے بیچ میں پتھر کا ایک شاندار چبوترہ تعمیر کروایا تھا تاکہ ایک مکبیر اس پر کھڑے ہو کر اذان دے اور نماز کی تکبیریں بلند آواز سے پڑھے جائیں تاکہ وہ تمام حاضرین کے کانوں میں گونج اٹھیں۔[21]

مسجد کی تمام منزلیں سفید سنگ مرمر میں سیاہ سنگ مرمر کی جڑی ہوئی ہیں جو انفرادی نماز کی جگہوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ منبر سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے اور اس قدر خوبصورت ہے کہ اسے مناسب طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ شمالی حصے کے برآمدے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ مقدس آثار رکھے گئے ہیں۔ یہ جگہ "مقام درگاہ اثار الشریف "(مقدس آثار کی مزار) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ برآمدہ بہت خوبصورت اور خوشگوار ہے۔ صحن کا رقبہ 136 مربع گز ہے اور بیچ میں سنگ مرمر کا ایک شاندار وضو ٹینک ہے جو پندرہ گز لمبا اور بارہ گز چوڑا ہے۔ اس کے مرکز میں ایک چشمہ ہے، جو ہر جمعہ، عید اور دیگر تعطیلات پر چلتا ہے۔پول کے جنوبی حصے میں 1766 میں محمد تحسین خان محلی بادشاہ (شاہی خواجہ سرا) نے ایک چھوٹی سی پتھر کی ریلینگ بنائی تھی جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس نے خواب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقام پر بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ مسجد کے صحنوں کے چاروں اطراف خوبصورت آئیون بنائے گئے ہیں جو برآمدے، خوشگوار کمروں اور عمارتوں کی طرف لے جاتے ہیں ۔ چاروں کونوں پر انتہائی خوبصورت مینار ہیں جنہوں نے مسجد میں رونق اور روشنی فراہم کی ہوئی ہے۔ جنوبی اور مشرقی صحنوں میں نماز کے اوقات بتانے کے لیے گھڑیاں ہیں۔ مسجد کے تین باریک پیتل کے دروازے شمالی انتیس سیڑھیوں پر، جنوب میں تینتیس سیڑھیوں پر اور مشرقی پینتیس سیڑھیوں پر ہیں۔[22]

سرسید اور جدید تعلیم

جیسا کہ واضح ہے ہر شخص کو اپنے نیک کاموں میں کسی نہ کسی طرح کی رکاوٹ آتی ہے سرسید کو بھی اپنے ہی دوست مرزا غالب (1797-1869) کی طرف سے بہت سے حوصلہ شکن تبصروں یا بجائے تجویز کردہ

مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اردو شاعر شمس الرحمان فاروقی (1935-2020) کے مطابق سر سید احمد نے شاعر مرزا غالب کو خط لکھا اور اپنی کتاب "آثارالصنادید"(1854) کے نئے ایڈیشن کے لیے تقریز (ایک قابل تعریف پیش لفظ) کی درخواست کی۔ حالانکہ سید احمد واضح طور پر اس قسم کے پیش لفظوں کی قدر کرتے رہے۔ غالب نے تذکرہ لکھا لیکن آخر میں سید احمد نے اسے کتاب میں شامل نہیں کیا۔بہت سارے لوگوں کا یہ بھی ماننا ہیں کہ سر سید نے مرزا غالب سے" آئین اکبری" کے لئے تقریز کی فرمائش کی تھی۔

مرزا غالب کی پیش لفظ کے طور پر لکھی گئی نظم میں ہندوستان میں انگریزی حکومت اور علم کی پیداوار جیسے مسائل پر غالب کے اپنے خیالات شامل ہیں۔چونکہ یہ نظم فارسی زبان میں ہے۔ اس لئے نظم کا ایک اقتباسکا ترجمہ درج ذیل ہے:[23]

"انگلستان کے صاحبان کو دیکھیں ،
ان کے اسلوب اور عمل کو دیکھیں۔ (13)
دیکھیں کہ انہوں نے سب کے لیے کیا قانون اور ضابطے بنائے ہیں،
انہوں نے وہ سب تیار کیا ہے۔ جو کبھی کسی نے نہیں دیکھا ۔ (14)
سائنس اور ہنر ان ہنرمندوں کے ہاتھوں پروان چڑھے،
ان کی کوششوں نے پیشواؤں کی کوششوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ (15)"

مرزا غالب اپنی نظم میں ان سے بنیادی طور پر ایسے سوالات پوچھتے ہیں: "ان قدیم تحریروں میں کیا قدر ہے؟ تم ماضی کی پوجا کرنے اور مردوں کی پرورش میں کیوں مصروف ہو؟ اس سے باہر آؤ اور دیکھو کہ اہل مغرب نے جس طرح کی حیرت انگیز سائنسی ایجادات کیے ہیں جیسے جہاز، بجلی کے تار، ماچس،بھاپ سے چلنے والی مشینیں اور ان سے بھی اور ان سے بھی بڑا ایک ضابطہ، ایک قانون اور ایک نظام!"[24]

مرزا غالب نےسر سید احمد خان کو نصیحت کی کہ اپنا وقت اور ہنر اس بات پر ضائع نہ کریں کہ جو کچھ مر چکا ہے، بلکہ حال کو دیکھیں ، اور اس بات کا مطالعہ کریں کہ انگلستان جیسی جدید ریاستوں نے کیا حاصل کیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ معروف اردو شاعر مرزا غالب سرسید احمد خان کے اہم محرکات میں سے ایک تھے ۔شاید سر سید کی تعلیمی فروغ کے رجھان میں ایک وجہ مرزا غالب کی تمبیح بھی رہی ہوگی. بہر حال سرسید احمد خان نے لندن کا دورہ کر کہ یہ معلوم کیا کہ جدید دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کے بارے میں خود آگاہی حاصل کی اور اسے اپنے ملک کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں سے متعارف کرایا جو سماجی اور تعلیمی لحاظ سے پیچھے رہ گئے تھے۔

1869 میں سر سید احمد خان نے لندن اور کیمبرج کا دورہ کیا اور 1870 میں ہندوستان واپس آئے اور کیمبرج اور آکسفورڈ پر مبنی ایک جدید کالج

اور سائنس سیکھنے کے اپنے اگلے بڑے منصوبے پر کام شروع کر دیا ۔ تعلیمی میدان میں سرسید احمد خان کا سب سے بڑا تعاون 1875 میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا قیام تھا۔ تعلیمی میدان میں اپنی کمان کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان میں مسلم نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کامیابیوں اور اسکالرشپ کی وجہ سے انہیں 1888 میں برطانوی ولی عہد نے نائٹ کمانڈر آف دی اسٹار آف انڈیا (KCSI)۔ بنایا۔ محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کو 1920 میں یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کہا گیا۔

حوالہ جات:

1. سرسید احمد کے آباؤ اجداد کا آبائی علاقہ عرب تھا۔ اس کے بعد وہ ہرات چلے گئے اور شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں ہندوستان آئے اور شاہی القابات اور وقار سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی کے زمانے میں ان کے دادا جواد علی خان بہادر کو "جواد الدولہ" کا خطاب ملا۔ جواد علی خان بہادر کو 1000 زات اور 500 سواروں کا منصب بھی ملا۔ ان کے دادا کی وفات کے بعد وہی منصب شاہ عالم کے زمانے میں سرسید کے والد سید محمد متقی خان بہادر کو ملتا رہا اور ان کی وفات کے بعد وہی موروثی لقب سر سید احمد خان کو عطا ہوا۔ سر سید احمد کے نانا کو "نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ" کا خطاب بھی حاصل تھا۔ انہیں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے آوا میں ایک مکمل پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد کے ادوار میں انہوں نے دہلی کے بادشاہ اکبر شاہ کے پاس وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔
2. 1862 میں جب سید احمد کو غازی پور منتقل کیا گیا تو انہوں نے اپنا ذاتی پرنٹنگ پریس خرید لیا جو ان کے تراجم اور دیگر سائنسی اور تاریخی کاموں میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ 1864 میں غازی پور میں "دی سائنٹیفک سوسائٹی" کے قیام کے لیے ان کا پریس زیادہ مددگار ثابت ہوا۔ 1866 تک سوسائٹی نے عوامی لیکچرز کا ایک سلسلہ تیار کیا اور یہاں تک کہ اراکین کو باخبر رکھنے کے لیے ایک جریدہ،" دی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" بھی شائع کیا۔
3. مرنالنی راجگوپالن (2016)۔ بلڈنگ ہسٹریز: دی آرکائیویل اینڈ ایفیکٹیو لائفز آف فائیو مانومنٹس ان ماڈرن دلھی، ساؤتھ ایشیا اکراس ڈسپلن، لندن، صفحہ 9۔
4. La langue et la literature Hindostanies (ہندوستانیوں کی زبان اور ادب) کے نام سے اشاعتوں کی ایک سیریز میں گارسن بیان کرتے ہیں ،

"سقراط، افلاطون، ارسطو، بیکن اور نیوٹن کی زندگی اور فارسی شاعر فردوسی، ہندو رامائن کے مصنف والمیکی ، کے مقابلے میں سید احمد کے دہلی کی مشہور یادگارعمارتوں پر انکے متن ہیں ہے" (جے ایچ ایس وی گرسن ڈی ٹیسی La langue et la literature Hindostanies en 1870 (The Language and Literature of Hindustanis in 1870) (Paris: Revue Annuelle, 1871)۔ گارسن کا سقراط اور نیوٹن کے تناظر میں سید احمد کا حوالہ اس کے ہندوستانی اعلیٰ فکر کو ظاہر کرتا ہے۔

5. الیگزینڈر کننگھم (1871)۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا: فور رپورٹس میڈ ڈیورنگ دی ا یئیر 1862-63-64-65، شملہ۔
6. آر ناتھ اور اجے ناتھ (2010)۔ مانومنٹس آف دہلی: آرکیالوجیکل اینڈ ہسٹوریکل ،دوسرا،ترمیم شدہ اور اپڈیٹڈ ، آگرہ، صفحہ v؛ سی ایم نعیم، "سید احمد اینڈ ہز ٹو بکس کالڈ آثارالصنادید،" ماڈرن ایشین اسٹڈیز، والیوم 45، نمبر 3 (2011)، صفحہ 675۔
7. کرسچن ڈبلیو ٹرول، "اے نوٹ آ ن این ارلی ٹپوگرافیکل ورک آف سید احمد خان: آثارالصنادید،"دی جرنل آف رائل اشیاٹک سوسایٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آ یرلینڈ ، نمبر دوم(1972)، صفحہ 135-146؛ سی ایم نعیم، "سید احمد اینڈ ہز ٹو بکس کالڈ آثارالصنادید،" ماڈرن ایشین اسٹڈیز، والیوم 45، نمبر 3 (2011)، صفحہ 669-708۔ دوسری جلد کا فرانسیسی میں ترجمہ مستشرق جوزف ہیلیوڈور سیگیس گارسن ڈی ٹیسی (1794-1878) نے کیا اور سید احمد کو 1865 میں برطانیہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں اعزازی رکنیت حاصل ہوئی ۔
8. اقتدار ایچ صدیقی، "سر سید احمد خانس اپروچ ٹو ہسٹری اینڈ ہسٹری رائٹنگ "، سرسید صد سالہ مقالے، کراچی، 1998، صفحہ 120۔
9. کرسچن ڈبلیو ٹرول، "اے نوٹ آ ن این ارلی ٹپوگرافیکل ورک آف سید احمد خان: آثارالصنادید،"دی جرنل آف رائل اشیاٹک سوسایٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آ یرلینڈ ، نمبر دوم(1972)، صفحہ 135-146۔
10. ہیبر ریجنالڈ ، نیریٹو آف اے جرنی تھرو دی اپر پروونسیز آف انڈیا وا لیوم اول ،(فلاڈیلفیا: کیری، لی اور کیری، 1828)، صفحہ 447۔
11. سی ایم نعیم، "سید احمد اینڈ ہز ٹو بکس کالڈ آثارالصنادید،" ماڈرن ایشین اسٹڈیز، والیوم 45، نمبر 3 (2011)، صفحہ 675۔
12. 12. الطاف حسین حالی (1994)۔ حیات جاوید، ترجمہ ڈیوڈ جے میتھیوز، دہلی، روپا اینڈ کمپنی، صفحہ 51۔

13. سر سید احمد خان (2011)۔ آثارالصنادید، اردو اکادمی، دہلی، صفحہ 54-152۔
14. مذکورہ بالا ، صفحہ151۔
15. مذکورہ بالا ، صفحہ152۔
16. مذکورہ بالا ، صفحہ166۔
17. مذکورہ بالا ، صفحہ 68-166۔ (مینار کی پہلی منزل کے بارے میں سرسید نے جو بیان کیا ہے وہ قطعی طور پر درست معلوم نہیں ہوتا۔ ڈھانچے کا رخ شمال کی طرف، گمشدہ چبوترہ اور گھنٹی اور زنجیر کا نقشہ اس بات کو ثابت نہیں کرتا کہ یہ ہندو مندر تھا۔ اگر ہم ہندو مندر کے فن تعمیر کا مطالعہ کریں اور مینار کی پہلی منزل سے موازنہ کریں تو ہمیں ہزاروں اختلافات نظر آتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ نہ مسجد تھی اور نہ ہی مقبرہ بلکہ ایک سادہ مینار تھا جو اس وقت کے ایک صوفی بزرگ قطب الدین بختیا ر کاکی کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اگر ہم سرسید کے نظریہ کو مانیں تو ہم صرف اس بات کی تائید کر سکتے ہیں کہ ابتداء میں رائے پتھورا نے تعمیر شروع کی ہو گی لیکن یہ نامکمل رہی ہوگی جب تک کہ ترک فتح اور قطب الدین ایبک اور التمش نے دہلی کے کئی دیگر ڈھانچوں کی طرح بعض ہندو مندروں کے پتھروں کا استعمال شاذ و نادر ہی کیا تھا)۔
18. مذکورہ بالا ، صفحہ 69-168۔
19. مذکورہ بالا ، صفحہ 70-169۔
20. مذکورہ بالا ، صفحہ 73-272۔
21. مذکورہ بالا ، صفحہ 74-273۔
22. مذکورہ بالا ، صفحہ 77-274۔
23. مرزا غالب اور مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (1967)۔ کلیاتِ غالب فارسی، ترجمہ شمس الرحمن فاروقی۔
24. https://www.indianewsstream.com/ghalib-advised-sir-syed-to-come-out-of-the-past- embrace-the-modern/